نجات ①

(دسمبر ۱۹۰۹ء)

(پادری میکلین کے لیکچر کا جواب)

از

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہِ الکریم

نجات

تمہید: ۴ دسمبر ۱۹۰۹ء کو پادری میکلین صاحب نے مشن کالج لاہور کے کمپاؤنڈ میں ایک لیکچر اس بات پر دیا تھا کہ نجات کیا ہے اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے اس لیکچر میں آپ نے گو وہی باتیں دہرائی ہیں جو ایک مدت سے مسیحی صاحبان فرمار ہے ہیں اور جن کا جواب سالہاسال سے دیا جا رہا ہے مگر اس خیال سے کہ مسیحی لیکچروں کو سننے کے بعد اگر لوگوں کو ساتھ ہی مسیحی نجات کی اصل حقیقت بھی معلوم ہو جائے تو شاید کسی نیک فطرت کو فائدہ پہنچے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے لیکچر کے جواب میں ایک مختصر سا مضمون لکھ کر ظاہر کروں کہ وہ نجات جو پادری صاحب نے بیان فرمائی ہے وہ اصل میں نجات ہے یا نہیں۔ پہلے اس کے کہ میں مسیحی نجات پر کچھ لکھوں گناہ کی تعریف اور جو کچھ اس کی نسبت قرآن شریف بلکہ توریت نے بھی بتایا ہے مختصراً بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

گناہ کی اصلیت یاد رہے کہ نجات کا سب دارومدار تقویٰ اور طہارت پر ہی ہے اگر کوئی شخص گناہوں سے بالکل پاک ہو جائے تو وہ نجات پا گیا اور جو گناہوں کے پھندے میں پھنس گیا اور شیطانی تصرف میں آگیا وہ ہلاک ہو گیا۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ گناہ کیا ہے یاد رہے کہ گناہ نام ہے ان خداداد طاقتوں کے غیر محل استعمال کرنے کا جو کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو عنایت فرمائی ہیں مثلاً انسان کو بہادری عنایت ہوئی ہے اگر کوئی شخص اس کو اس کے محل پر استعمال نہ کرے اور غیر محل اور ناجائز استعمال شروع کر دے تو اس کا نام ظلم ہو جائے گا اور وہ گناہ کہلائے گا۔ یا ایک شخص کو دولت دی گئی ہے اور وہ اس کو ناجائز طور سے استعمال کرتا ہے تو وہ مسرف کہلا کر گناہ گار ٹھہرے گا اور جس کو عقل اور دانائی دی گئی ہو وہ اسے غیر محل استعمال کرکے فریب و دغا کرے تو وہ گناہ گار کہلائے گا اسی طرح اعضائے انسانی میں زبان کو، آنکھوں کو، کانوں کو، ناک کو، ہاتھوں کو، پاؤں کو غرضیکہ ہر ایک عضو کو غیر محل استعمال کرنے والا گناہ گار ہے اور خدا کے حضور میں قصوروار۔ اور وہ جو میانہ رو ہے اور صراط مستقیم سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتا وہ متقی اور پرہیزگار

ہے۔

پس گناہ اسی کا نام ہے کہ انسان اعتدال کو چھوڑ دے اور اپنے فرائض منصبی میں کمی کرنے لگ جائے یا زیادتی شروع کردے مثلاً انسان کو شہوانی قویٰ عنایت کئے گئے ہیں کوئی شخص انمیں اعتداء کرتا ہے اور عدل پر قائم نہیں رہتا اور ان قویٰ کو اپنے موقعہ اور محل پر استعمال نہیں کرتا اور بیوی کو چھوڑ کر غیر عورت پر استعمال کرتا ہے تو ایسا شخص چونکہ اعتدال کو ہاتھ سے دے بیٹھا اس لئے گناہ گار کہلائے گا اور خدا کے حضور میں مجرم سمجھا جائے گا لیکن جو اس قوت کو برمحل اور باموقعہ استعمال میں لاتا ہے وہ متقی ہے اور وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (المؤمنون:۶) کے گروہ میں شامل ہے غرض کہ اسی طرح کل گناہوں کو دیکھ لو کہ نیک صفات کو اعتدال سے استعمال نہ کرنے سے ہی پیدا ہوتے ہیں ورنہ اصل میں گناہوں کا وجود نہیں۔

قرآن شریف میں گناہ کی تعریف

پس مشاہدہ ہم کو یہ بات بتاتا ہے کہ گناہ صرف صراط مستقیم کو چھوڑنے کا نام ہے چنانچہ سورۃ فاتحہ میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ یعنی متقیوں کی راہ وہ ہے جو سیدھی ہو اور اعتدال سے ہو اور وہ لوگ جو تقویٰ سیکھنا چاہیں انہیں چاہئے کہ دعا مانگیں کہ انہیں بھی ان لوگوں کی پیروی کی توفیق ملے اور ایسا نہ ہو کہ وہ یہودیوں کی طرح ہو جائیں کہ جنہوں نے مسیح اور آنحضرت ﷺ کے نہ ماننے سے انبیاءؑ اللہ کی تعظیم میں کمی کی اور سبت میں اعتداء کیا اور اسی طرح مسیحیوں کی پیروی نہ اختیار کریں کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ اور خود اپنی شریعت کو نہ مان کر تفریط سے کام لیا اور مسیح کی محبت میں حد سے زیادہ غلو کیا اور دوسرے بتایا کہ ایسا نہ ہو کہ تم کسی سے بے جا عداوت کر بیٹھو یا علم صحیح اور علم الٰہی جو تم کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ملا ہے کی خلاف ورزی کرو اور مغضوب بن جاؤ یا کسی سے زیادہ اور بے جا محبت کر کے اور ان علوم الٰہیہ کے خلاف جن کو انبیاءؑ لائے چل کر ان سے محروم رہ جاؤ اور ضلال میں پڑ جاؤ۔

پس اس سورۃ میں خدائے تعالیٰ نے گناہ کی کیفیت کھول کر بیان فرمادی ہے کہ وہ اصل چیز کیا ہے غرض کہ نیکی اصل اور صراط مستقیم ہوتی ہے اور بدی صراط مستقیم سے ادھر ادھر ہونے کو کہتے ہیں چنانچہ انسان میں جو اصل چیز پیدا کی گئی ہے وہ حسن ہے چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین:۵) اور پھر اس طرح خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ قُلْ اِنَّنِيْ

هَدٰنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (سورۃ انعام: ۱۶۲) یعنی کہہ دے کہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو صراط مستقیم کی ہدایت کی ہے جو کہ استوار اور بے کجی کی ہے اور ابراہیمؑ کا طریقہ ہے جو اعتدال پر قائم رہنے والا انسان تھا پھر خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ (الزمر: ۲۹) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (سورۃ کہف: ۲) اور پھر سورہ فرقان میں فرماتا ہے عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (الفرقان: ۶۴) یعنی ہمارے پاک بندے وہی ہیں کہ جو اپنی ایام زندگی کو جو کہ ان کو وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ (البقرہ: ۳۷) کے حکم کے مطابق اس زمین پر گزارنے پڑتے ہیں اعتدال کے ساتھ گزارتے ہیں اور ان کی زندگی سکینت اور وقار کے ساتھ ہوتی ہے نہ تو تیزی سے کام لیتے ہیں اور نہ کمال سستی کو برتتے ہیں بلکہ تمام عمر فتنوں اور فسادوں سے بچتے رہتے ہیں اور اگر کوئی شریر جاہل ان سے بات کرتے ہیں اور جھگڑا برپا کرنا چاہتے ہیں تو وہ درگذر کر جاتے ہیں۔

قرآن شریف نے گناہ کیلئے کون سے الفاظ استعمال کئے ہیں

غرض کہ اول تو میں نے عقلاً ثابت کیا ہے کہ گناہ اصل میں راہ راست سے ادھر ادھر پھر جانے کا نام ہے اور پھر قرآن شریف کا مذہب بیان کیا ہے کہ قرآن شریف نے اس مسئلہ کو خوب حل کیا ہے چنانچہ ان آیات کے علاوہ جو میں اوپر درج کر آیا ہوں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن شریف نے جس قدر الفاظ گناہ کیلئے استعمال کئے ہیں وہ لغت عرب میں یا تو زیادتی کے یا کمی کے معنی دیتے ہیں چنانچہ اثم کے معنوں میں کمی مفہوم ہے جیساکہ آثمہ عربی میں اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو سست چلتی ہو اور پھر جناح بھی جھک جانے اور اعتدال کو چھوڑ دینے کو کہتے ہیں اسی طرح ذنب زیادتی کے معنے دیتا ہے اور پھر اعتداء اور عصیان اور افراط وغیرہ سب الفاظ زیادتی اور شدت کے معنے دیتے ہیں پس صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیساکہ عقل انسانی چاہتی ہے قرآن شریف نے بھی گناہ کو راہ راست سے بڑھ جانے یا پیچھے رہ جانے سے تعبیر کیا ہے اور اصل پیدائش انسان کی نیکی اور تقویٰ پر رکھی ہے پس اب ہم پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ خدا نے گناہ کیوں پیدا کیا کیونکہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو چند صفات حسنہ ودیعت کر کے اسے ایک حد تک مقدرت دے دی کہ ان پر عمل کر کے مدارج ترقی حاصل کرے اب یہ اسکا اپنا قصور ہے کہ ان کے پورا کرنے میں کوتاہی کرے یا اعتداء کرے۔

دلیل عقلی غور کر کے دیکھ لو چونکہ انسان میں اصل میں نیکی کا مادہ ہے اس لئے زیادہ تر کام اس کی نیکی کے ہوتے ہیں مثلاً ایک شخص جس کو جھوٹا کہا جاتا ہے وہ دن بھر میں سینکڑوں تو سچ بولتا ہے ہاں ایک دو جھوٹ بھی بول لیتا ہے اور ان ایک دو جھوٹوں کی وجہ سے وہ جھوٹا کہلاتا ہے اور یہ اس لئے کہ اس نے قانون فطرت کو توڑ دیا اور اصل راہ سے پھر گیا اس لئے جب انسان سچ بولتا ہے تو لوگ حیران نہیں ہوتے اور وہ ایک معمولی بات سمجھی جاتی ہے مگر جب کوئی جھوٹ بولے تو سب کے سب اسکی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں کہ یہ کیا بکواس کرتا ہے۔

چنانچہ ہمارے آنحضرت ﷺ نے اس مسئلہ کو کیا خوب ادا کیا ہے اَللّٰھُمَّ نَقِّنِیْ مِنْ خَطَایَایَ کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ جس سے معلوم ہؤا کہ اصل میں انسانی دل سفید کپڑے کی طرح ہے اور پھر قرآن شریف میں بھی خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا (الروم:۳۱) یعنی انسان کے خصائل اور ثنایا خدائے تعالیٰ کے اخلاق پر پیدا کئے گئے ہیں اور یہ بات بدیہی ہے جیسا کہ میں پچھلی مثال میں ثابت کر آیا ہوں کہ اصل نیکی ہے بدی صرف اعتداء کا نام ہے۔ جیسے کہ آنکھ دیکھنے کیلئے دی گئی ہے اور دیگر فوائد کیلئے عنایت کی گئی ہے اس کو بدنظری کے کام میں لانا یا کانوں کو غیبت کے سننے پر لگانا یا زبان سے بدگوئی کرنا۔ پس میں نے پوری طرح سے ثابت کر دیا ہے کہ بدی اعتداء ہے۔

صراطِ مستقیم کیا ہے اب یہ ضرورت پڑے گی کہ یہ بات کس طرح معلوم ہو گی کہ صراطِ مستقیم کیا ہے اور کونسا ہے سو اول تو خود فطرت انسانی انسان کو اس کا پتہ دیتی ہے اور دوسرے اس کے پہچاننے کے لئے یہ سب سے عمدہ معیار ہے کہ جس قدر باتیں انسان کے دل میں تعظیم الٰہی پیدا کریں اور اس کو مخلوق کی شفقت پر مائل کریں اور فساد سے اس کا دل پھیر دیں تو وہ تو صراطِ مستقیم ہیں اور جو اس کے برخلاف ہوں وہ سب گناہ اور بدیاں ہیں اور انہی احکام کے اظہار کے لئے شریعتیں آتی ہیں تاکہ خدائے تعالیٰ انسان کو اپنی رضاء کے تمام احکام بتا دے اور وہ باخبر ہو جائے کہ کونسی راہیں کمی کی اور کونسی زیادتی کی ہیں اور کونسی کَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا (الفرقان:۶۸) کی راہیں ہیں

پس معلوم ہؤا کہ انسانی اعمال کو ٹھیک کرنے والی شریعت ہی ہے کیونکہ وہ انسان کو ان راہوں سے واقف کرتی ہے کہ جو مستقیم ہوتی ہیں کیونکہ انسان کو معرفت ہی ایک کام کے کرنے پر تیار کرتی ہے اور وہی دوسرے کام سے روکتی ہے مثلاً ایک شخص کو جب علم کی معرفت حاصل ہو اور وہ اس

کے فوائد پر آگاہ ہو جائے تو خود بخود اس کے پڑھنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے چنانچہ جس قدر کوئی کسی نیک چیز کا عرفان حاصل کرے اسی قدر اس کی طرف زیادہ جھکتا ہے اور جس قدر کسی بد چیز کا عرفان حاصل ہو اسی قدر بچتا ہے چنانچہ جس کو اچھی طرح سے زہر کے خواص پر واقفیت ہو وہ زہر کا پیالہ کبھی نہ پیئے گا اور جو آگ کی طاقت سے واقف ہو وہ کبھی اس میں ہاتھ نہیں ڈالے گا اور یہ جانتے ہوئے کہ اس بل میں سانپ ہے اور سانپ کے کاٹنے سے کیا نقصان ہوتا ہے کوئی اس بل میں ہاتھ ڈالنے کی جرات نہ کرے گا پس اصل چیز جو گناہوں سے انسان کو روک سکتی ہے وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور فضل کا جاذب ایمان ہے اور جیسے ایمان بڑھے گا ویسے ہی اعمال ہوں گے اور ایمان شریعت کو چاہتا ہے بے علم انسان کیلئے کوئی لاکھ اپنا سر پھوڑے یا کسی اور کو زہر دے دے لیکن اگر وہ آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے تو وہ جلے گا اور اگر پہاڑ سے بے سامان کودتا ہے تو ہڈی پسلی تڑوائے گا۔

پس چونکہ گناہ سے نجات ہی اصل نجات ہے جیسا کہ خود پادری میکلین صاحب نے اپنے لیکچر میں بیان کیا ہے اس لئے معلوم ہؤا کہ اصل ذریعہ نجات کا فضل ہے اور اس کا جاذب ایمان اور اعمال تو ایمان کے ثمرات ہوں گے اور شریعت کاملہ کے بغیر کوئی چیز نجات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی کیونکہ علم تام سے ہی انسان نیکی کرتا اور گناہ سے بچتا ہے یعنی راہ راست سے ادھر ادھر نہیں ہوتا پس جب فضل کے ساتھ علم تام ہو اور صراط مستقیم سے کامل واقفیت ہو تو ایسا انسان گناہوں سے بچ گیا اور ناجی ہؤا کیونکہ عرفان کامل کے بعد گناہ سرزد نہیں ہو سکتا اور اس بات کو ہمارے حضور ﷺ نے بھی لیا ہے جبکہ فرمایا کہ اگر تم کو وہ علم ہو جو کہ مجھ کو حاصل ہے تو تم ہنسو کم اور روؤ زیادہ یعنی علم تام کے بعد انسان گناہوں سے بچ جاتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ نیک لوگ ہوتے رہتے ہیں

چنانچہ برخلاف پادری میکلین کے جو کہ کہتے ہیں کہ کوئی آدمی دنیا میں نیک نہیں ہوا اور نہ کسی نے دعویٰ کیا- ہمارا ہادی فرماتا ہے قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (الانعام: ۱۶۲) بلکہ آپ ؐ کے اتباع کرام ؓ کی نسبت ارشاد ہے اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ (التوبہ: ۱۰۰) پھر بدری صحابیوں ؓ کی نسبت آیا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (حم السجدۃ: ۴۱) یعنی اب تم اس قدر عرفان حاصل کر چکے ہو کہ اب تمہارا ہر ایک کام نیکی ہی ہو گا اور بدی سے تم بالکل محفوظ ہو گئے ہو اور تمہارے ذرہ

ذرہ میں صراط مستقیم کی شناخت سرایت کر گئی ہے پس تمہارے ہر ایک کام میں اب نیکی ہی نیکی ہو گی۔ اسی طرح مذہب اسلام کا دعویٰ ہے کہ کل انبیاءؑ بالکل پاک اور نیک تھے چنانچہ ہمارے آنحضرت ﷺ تو عام دنیا کو للکار کر فرماتے ہیں کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا (یونس:۱۷) یعنی میں تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں کیا تم نے مجھ میں کچھ گناہ دیکھا ہے کہ اب مجھ کو جھوٹا سمجھتے ہو چنانچہ کسی سے جواب نہ بن آیا۔ اسی طرح امت محمدیہ میں سینکڑوں نہیں ہزاروں اس قسم کے لوگ پیدا ہوئے ہیں اور اس وقت بھی ہیں چنانچہ ابھی ایک شخص نے خدا کی طرف سے مأمور ہو کر ساری دنیا کو پکارا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا لیکن کوئی مقابلہ نہ کر سکا غرض کہ اسلام کا دعویٰ ہے کہ میں نہ صرف پاک اور ناجی لوگ ہی پیدا کرتا ہوں بلکہ ایسے لوگ بھی میری اتباع سے پیدا ہوتے ہیں کہ جو انبیاءؑ کا درجہ رکھتے ہیں اور الہام الٰہی سے مشرف ہوتے ہیں پس باوجود اس دعویٰ کے پادری صاحب کا کیا حق ہے کہ وہ کہیں کہ کوئی نہیں جو اپنے آپ کو شریعت پر چل کر گناہوں سے پاک قرار دیتا ہو حالانکہ مسلمانوں میں ایسے لوگ ہو گذرے ہیں اور ہر زمانہ میں آتے ہیں۔

قرآن شریف انسان کو پاک قرار دیتا ہے

اور پھر پادری صاحبان کا کہنا کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں آدمؑ کی نسبت بھول کا لفظ استعمال کیا ہے اس میں کیا حرج ہے۔ کاش کہ آپ اتنا سمجھتے کہ گناہ اور نسیان میں بڑا فرق ہے۔ پھر آپ نے فرمایا ہے کہ قرآن شریف میں ہے کہ انسان میں عزم نہیں ہے افسوس اگر آپ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران:۱۶۰) کو دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ وہ بدوں کی نسبت ہے نیک لوگ بڑے عزم والے ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہنا بھی غلط ہے کہ انسان بے صبر پیدا کیا گیا ہے کیونکہ دوسری طرف بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ بھی تو قرآن شریف میں ہے کہ تیرے پیروؤں میں ایک گروہ صابرین کا ہے۔ پھر سورۃ اعراف میں ہے کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا (الاعراف:۱۳۸) مؤمنون میں ہے کہ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا (المؤمنون:۱۱۲) فرقان میں ہے کہ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا۔ (الفرقان:۷۶) قصص میں ہے کہ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا (القصص:۵۵) باوجود اس قدر شہادتوں کے پھر کہنا کہ انسان بے صبر پیدا کیا گیا ہے ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہاں بھی نیکوں اور بدوں کی ہی تفریق ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف میں انسان کو ظلم پیشہ اور جاہل قرار دیا ہے مگر آپ کی نظر وہاں نہ پڑی جہاں کہ خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ

الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران: ۱۳۵) پھر آپ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ انسان ٹوٹے میں ہے مگر ساتھ ہی آپ نے یہ نہ دیکھا کہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر: ۴) پھر آپ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف میں ہے کہ انسان کا دل وسوسہ پیدا کرتا ہے یہ بالکل غلط ہے ثبوت دو اور پھر یہ نہ دیکھا کہ اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ (المائدہ: ۴) اور پھر ایک جماعت کے لئے رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ بھی قرآن شریف میں ہے اور پھر شیطان کی نسبت فرماتا ہے کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا (بنی اسرائیل: ۶۶) یعنی نفسانی وساوس انہی لوگوں کے دلوں میں اٹھتے ہیں کہ جو گندے اور حق سے دور ہوں نیک لوگ اس سے بالکل پاک ہوتے ہیں پس اسلام نے ہرگز انسان کو گناہوں کا پتلا قرار نہیں دیا بلکہ ایک پاک مخلوق جو کہ جب راہ راست سے پھر جاتی ہے تو ناپاک ہو جاتی ہے اس طرح مسیح صاحبان کا وہ اعتقاد بھی برباد ہو جاتا ہے کہ گناہ انسان کو ورثہ میں ملا ہے۔

گناہ کی سزا

پھر پادری صاحب کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ چونکہ ہم کو گناہ سے نفرت ہے اس لئے اس کی سزا ضروری ملنی چاہیئے اور چونکہ سزا نہ دینے سے عدل میں فرق آتا ہے اس لئے اس کی سزا ضرور دینی چاہیئے۔ یاد رہے کہ انسانی فطرت بخشش کو زیادہ چاہتی ہے جیسے کہ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بنی نوع انسان ایک دوسرے کے قصوروں کو بخوشی بخش دیتے ہیں اور لاکھوں خطاؤں پر چشم پوشی کر دیتے ہیں پس اگر خدائے تعالیٰ ہر ایک ذرہ ذرہ سے گناہ کو پکڑے تو بڑا اعتراض آئے گا کہ بڑا سخت اور ظالم ہے کیونکہ دنیا میں بھی گناہوں پر چشم پوشی نہ کرنے والے لوگ ظالم ہی سمجھے جاتے ہیں ورنہ کسی کو حد سے زیادہ تکلیف دینے والے لوگ تو کم ہی ہوتے ہیں اور خدائے تعالیٰ پر یہ بھی اعتراض آئے گا کہ کیسا سخت گیر ہے کہ عدل کی صفت پر تو چلتا ہے کہ میرے بندوں میں ہے تو مجھ میں کیوں نہ ہو مگر جو رحم اور بخشش کی صفت ہے اس سے بکلی محروم ہے تو ایسا خدا گویا اپنی پیدا کردہ مخلوق تباہ کر کے خوش ہوتا ہے۔ اسلام اس کے برخلاف بتاتا ہے کہ اَوْ یُوْبِقْهُنَّ بِمَا کَسَبُوْا وَیَعْفُ عَنْ کَثِیْرٍ (الشوریٰ: ۳۵) یعنی خدائے تعالیٰ چاہے تو گناہ گاروں کو ہلاک کر دے مگر وہ اکثر معاف کر دیتا ہے۔

عدل کو مان کر مسیحیت کا خاتمہ

علاوہ ازیں اگر عدل صفت مانا جائے گا تو پھر مسیحیوں کا مذہب برباد ہو جائے گا سنئے یسوع عدل کی مٹی خراب کرتا

ہے متی باب ۵ آیت ۳۸ تا ۴۱ میں ہے کہ ''تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اسکے آگے پھیر دے اور اگر کوئی چاہے کہ تجھ پر نالش کر کے تیری قبا لے کُرتے کو بھی اسے لینے دے اور جو تجھے ایک کوس بیگار لے جاوے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا'' اب فرمایئے کہ عدل کہاں رہا۔ توریت نے تو عدل کی تعلیم دی تھی مگر یسوع نے اسکو ایسا تباہ کیا کہ عدل کا نام و نشان ہی نہ چھوڑا اب بتایئے کہ اگر یہ تعلیم اچھی ہے تو بقول آپ کے کیا وہ نیکی جو انسان میں ہے وہ خدا میں نہیں اور اگر بری ہے تو مسیحی مذہب کا تب بھی خاتمہ ہے پس سچی بات وہی ہے کہ جو اسلام نے بتائی ہے۔

اسلام اصلاح چاہتا ہے

جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (الشوریٰ:۴۱) یعنی تکلیف کا بدلہ اتنی ہی تکلیف ہے مگر جو بخش دے اور ایسی بخشش کرے کہ اس سے اصلاح ہو تو اس کو خدا تعالیٰ اعلیٰ اجر دے گا۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ خدا تعالیٰ ظالمین کو پسند نہیں کرتا یعنی نہ اس کو جس نے ظلم کیا نہ اس کو جس نے باوجود اس کے کہ رحم میں اصلاح ہوتی تھی رحم نہ کیا اور نہ اس کو کہ جس نے ایسے موقعہ پر رحم کیا کہ وہ صریح طور سے فساد پیدا کرنے والا تھا پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (الشوریٰ:۴۴) یعنی جو اصلاح کے لئے صبر کرے اور چشم پوشی سے کام لے اس نے بڑا عظیم الشان کام کیا اس سے پادری صاحب کا پہلا اعتراض بھی اٹھ جاتا ہے کہ مخلوق میں عزم نہیں خدا تعالیٰ نے تو عزم پیدا کرنے کی ترکیب بھی بتا دی کہ صبر اور چشم پوشی سے کام لو تو عزم کی صفت تم میں پیدا ہو جائے گی۔ غرض کہ انسان میں عدل ادنیٰ درجہ کی صفت ہے اور رحم اس سے اعلیٰ۔ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ مالک قرار دیا گیا ہے پس مالک مختار ہے کہ جس کو چاہے چھوڑ دے ہاں بے گناہ کو وہ نہیں پکڑتا کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ مَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (ق:۳۰) یعنی میں اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

کیا گورنمنٹ رحم نہیں کرتی؟

اور یہ کہنا کہ گورنمنٹ رحم نہیں کرتی اس لئے خدا بھی نہیں کرے گا ٹھیک نہیں کیونکہ کسی گورنمنٹ کا کام حجت نہیں ہو سکتا ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی فطرت ایسا چاہتی ہے اور بقول آپ کے جو نیک صفت ہم میں ہو وہ خدا تعالیٰ میں بدرجہ کمال ہونی چاہیئے۔ علاوہ اس کے یہ بات ہے کہ گورنمنٹ کے کام کا اثر ایک

ملک پر پڑتا ہے ممکن ہے کہ ذرا سی غلطی میں کوئی تباہی آجاوے اور دوسرے گورنمنٹ دلوں کی واقف نہیں کہ یہ شخص سچی توبہ کرتا ہے کہ نہیں تیسرے گورنمنٹ انسانی اجسام اور ارواح کی مالک نہیں ہوتی کہ سب گناہوں پر چشم پوشی کی اس کو طاقت ہو جیسے کہ اسلام میں ایک قاتل کو گورنمنٹ معاف نہیں کر سکتی ہاں مقتول کے وارث کر سکتے ہیں آخر میں یہ بات عرض کروں گا کہ یہ بھی جھوٹ ہے کہ گورنمنٹ معاف نہیں کرتی گورنمنٹ کرتی ہے اور سینکڑوں کو کرتی ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ایسے صدہا واقعات ہوئے ہیں کہ اگر ججوں نے معاف نہیں کیا تو صوبہ کے گورنر یا خود وائسرائے نے سزا معاف کر دی ہو۔ پھر آپ وہ بات کہتے کیوں ہیں کہ جو اصل میں غلط ہے؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ مسیحؑ نے جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں رحم ہی رحم کی تعلیم دی ہے عدل کو برباد کر دیا ہے۔ پس اب میں ثابت کر چکا ہوں کہ گناہ معاف ہونے ضروری ہیں اور انسانی فطرت اس کو چاہتی ہے اور جو مذہب اس کے برخلاف کہتا ہے وہ واقعہ و حقیقت سے محجوب ہے۔ غرض کہ گناہ کا معاف ہونا ضروری ہے اور عقل اسی کو چاہتی ہے۔ اسلام نے اسے ایک اعلیٰ پیرایہ میں بیان فرمایا ہے خود عیسائیوں نے اسے لیا ہے مگر ایک بھدے اور خطرناک رنگ میں۔

انسان گناہوں سے بچ سکتا ہے

جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں انسان گناہوں سے بچ سکتا ہے اور گناہ معاف ہو سکتے ہیں اور کامل شریعت کے ذریعہ کامل معرفت حاصل کر کے انسان گناہوں سے بچ سکتا ہے۔ اور جو شریعت انسان کو گناہوں سے بچاتی نہیں وہ ناقص ہے اور کسی کام کی نہیں پس سچی بات یہی ہے کہ گناہوں سے انسان کامل شریعت کی معرفت بچ سکتا ہے اور وہ مذہب جو اس کے برخلاف کہتا ہے وہ الزام سے بچنے کیلئے کہ میری قلعی نہ کھل جائے ایسا کرتا ہے اور انسانوں پر الزام دیتا ہے کہ تم ہی گندے ہو ورنہ میں تو پاک ہوں۔ کیا ایک پولیس مین کے سامنے چور چوری کرتا ہے ہرگز نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے نقصان پہنچے گا نہ اس لئے کہ اس کے لئے کوئی شخص پھانسی پر چڑھ چکا ہے۔ کیا ایک فوج کی موجودگی میں ڈاکو ڈاکہ ماریں گے کبھی نہیں نہ کسی کفارہ کی وجہ سے بلکہ اس لئے کہ ان سے بڑی طاقت وہاں موجود ہے جو ان کو سزا دے گی۔ اسی طرح شریعت علاوہ اعمال حسنہ کے بتانے کے خدا تعالیٰ کی قدرت اور طاقت اس قدر انسان پر روشن کر دیتی ہے کہ وہ گناہ پر قادر ہی نہیں رہتا پس کیا پولیس مین کی آنکھ سے تو چور چوری کو چھوڑ سکتا ہے مگر خدا تعالیٰ کی آنکھ کا کامل علم رکھتے ہوئے وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ پس اصل بات یہی ہے کہ کامل معرفت انسان کو گناہ سے بچاتی ہے ورنہ تجسم کا سب ڈھکوسلا ہے اور وہ

اس لئے کہ شریعت کے عیب نہ کھل جائیں۔

انسان انسانی نمونہ کا محتاج ہے

باقی یہ بات کہ انسان کے لئے نمونہ چاہیئے بالکل درست ہے مگر وہ آدمی چاہیئے نہ کہ خدا۔ کیا ہمیں معلوم نہیں کہ خدا پاک ہے پھر خدا ہم کو نمونہ کیا دکھائے گا اور کیا جو کام خدا کر سکے وہ بندہ بھی کر سکتا ہے اگر خدا نے ایک نمونہ دکھایا تو کیا ہؤا ایک شخص اعتراض کر سکتا ہے کہ وہ خدا تھا اس نے وہ کام کر لئے میں بندہ ہوں مجھ سے نہیں ہو سکتے انسان پر حجت انسانی نمونہ کی ہو سکتی ہے نہ کہ خدا کے نمونہ کی۔ خدا کو تو ہم پہلے ہی پاک جانتے ہیں اور اگر کہا جاوے کہ خدا انسانی قالب میں آیا تھا اور انہیں طاقتوں کے ساتھ تو پھر یہ اعتراض ہو گا کہ جب اس میں وہی طاقتیں تھیں جو انسان میں ہوتی ہیں تو پھر اس میں اور انسان میں فرق کیا رہا۔ بجائے اس کے کہ آپ عرش سے تشریف لاتے یہیں سے کوئی بندہ چن لیا جاتا اور اس صورت میں یہودیوں کو اسبات پر فخر کرنے کا موقعہ بھی نہ رہتا کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے خدا کو مار اپیٹا اور سولی پر کھینچ دیا غرض کہ مسیحی جو نجات کیلئے خدا کے تجسم اور کفارہ کے قائل ہیں یہ ایک لغو بات ہے۔

مسیحیوں سے چار سوال

چنانچہ میں اس مضمون پر کچھ اور لکھنے سے پہلے مسیحیوں سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اول سب سے پہلے ثابت کیا جائے کہ خدا تین ہیں کیونکہ جب تک خدا تین ثابت نہ ہو جائیں تو نہ کفارہ رہتا ہے نہ نجات۔ توریت میں تو ہے کہ ہمارے خدا کا شریک کوئی نہیں خروج باب ۸ آیت ۱۸ یہودی اب تک اسی پر عمل کرتے ہیں الفاظ ان کی تائید کرتے ہیں دوم اگر تین خدا ہیں تو یسوع ہی وہ تیسرا خدا ہے کیونکہ بیٹے کا لفظ بہتوں پر بولا گیا ہے آدمؑ کو بھی خدا کا بیٹا کہا گیا ہے اور اس کا کوئی باپ بیان نہیں کیا بلکہ ملک صدق تو سارے جہاں اور مسیحؑ سے زیادہ ہیں یسوع صرف اپنے آپ کو ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ حواریوں کو بھی خدا کا بیٹا قرار دیتا ہے بلکہ اپنے آپ کو تو ابن آدم ہی کہتا ہے پس یا تو حواری بھی خدائی میں ساتھ شریک ہیں یا مسیح بھی نہیں اور پھر ایک مشکل ہے کہ متی میں یسوع یوسف کا بیٹا قرار دیا گیا ہے جو اور بھی مشکل میں ڈالتا ہے ورنہ یہودی کمبخت بہت کچھ اعتراض کرتے ہیں مگر کچھ بھی ہو اناجیل سے یسوع کی خواہ کس قدر عظمت ہی بیان کی جاوے ملک صدق کے برابر تو وہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا کیونکہ جو صفات ملک صدق میں بیان کئے جاتے ہیں وہ اسے یسوع پر بہت کچھ فضیلت دیتے ہیں اور نہ صرف توریت میں بلکہ زبور میں اور پھر اعمال میں بھی اس کا ذکر کیا ہے

چنانچہ پیدائش باب ۱۴ آیت ۱۸ میں ہے کہ ملک صدق کا بادشاہ روٹی اور مے نکال لایا اور وہ خدا تعالیٰ کا کاہن تھا پھر ابراہیم نے اسے دہ یکی بھی دی زبور میں داؤد کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ "خداوند نے قسم کھائی ہے اور وہ کبھی نہ پچھتائے گا تو ملک صدق سالم کی طرح ابد تک کاہن ہے" پھر عبرانیوں میں پولوس رسول مسیح کی نسبت کہتا ہے کہ "وہ خدا کی طرف سے ملک صدق کی مانند سردار کاہن کہلایا" پھر اسی جگہ اس کی نسبت لکھا ہے کہ "وہ پہلے اپنے نام کے موافق راستے کا بادشاہ ہے اور پھر شاہ سالیم یعنی سلامتی کا بادشاہ یہ بے باپ بے ماں بے نسب نامہ جس کے نہ دنوں کا شروع نہ زندگی کا اخیر مگر خدا کے بیٹے سے مشابہ ٹھہرا" ان عبارات سے تو ملک صدق سالیم کی شان زیادہ معلوم ہوتی ہے وہ ازلی ابدی ہے اور بے ماں باپ کے ہے حالانکہ یسوع کا باپ اگر یوسف نہیں تو ماں مریم تو ضرور تھی مگر وہ بن باپ بن ماں کے اور پھر ازلی ہمارے خیال میں تو وہ ابنیت کا زیادہ مستحق ہے۔ سوم یہ کہ مسیح خوشی سے مرنا نہ چاہتا تھا کیونکہ انجیل میں ہے کہ "اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے گزر جائے تو بھی میری خواہش نہیں بلکہ تیری خواہش کے مطابق ہو" متی باب ۲۶ آیت ۳۹۔ اب اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ یسوع کی اپنی مرضی نہ تھی کہ وہ صلیبی موت مرے جس سے معلوم ہوا کہ اس نے کسی کے بدلے میں اپنی جان نہیں دی بلکہ قہر درویش بر جان درویش پر عمل کرتے ہوئے مرا دوسرے یہ کہ خدا نے زبردستی اس کو دار پر کھنچوایا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ "تیری خواہش کے مطابق ہو" پس اس طرح خدا ظالم ٹھہرا کہ اس طرح بے دردی سے ایک بے گناہ کو اور پھر اپنے بیٹے کو جو اس کی بادشاہت میں اور خدائی میں بھی شریک تھا۔ یوں مروا دیا۔ شاید اس خیال سے کہ ایک شریک تو راستہ سے ہٹے۔ چہارم سوال یہ کہ سب کچھ ہی مانا مگر یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ مسیح واقعی صلیب پر مر گیا تھا کیونکہ انجیل اس کے بر خلاف کہتی ہے جیسا کہ میں نے لکھا ہے یعنی حاکم وقت چاہتا تھا کہ وہ بچ جائے۔ پھانسی دینے والا اس کا اپنا مرید تھا۔ قبر سے اٹھنے کے بعد وہ مریدوں کے پاس گیا وہ ڈرے کہ کہیں بھوت نہ ہو مگر اس نے اپنے زخم ان کو دکھائے۔ پھر ان کا شک دور کرنے کے لئے ان کے ساتھ روٹی کھائی اور لوگوں سے چھپتا پھرا۔ اگر وہ جی اٹھا تھا اور اب پھر خدا ہو گیا تھا تو لوگوں سے اس قدر ڈر کیوں تھا؟

غرض جب تک یہ سوال حل نہ ہو جائیں مسیحی صاحبان کا کوئی حق نہیں کہ وہ نجات کو ثابت کرنے بیٹھیں خیر اب میں اس مضمون پر مسیحی صاحبوں کے جواب دینے کے بغیر ہی کچھ روشنی ڈالتا ہوں۔

مسیح نے کوئی دعویٰ نہیں کیا

یاد رہے کہ ہر ایک بات کو ثابت کرنے کے لئے پہلے دعویٰ ہوتا ہے پھر دلیل پس لازم تھا کہ یسوع کی ابنیت اور کفارہ کے مسئلہ کو پہلے تو انجیل سے ثابت کیا جائے مگر پادری صاحب نے انجیل کی ایک آیت بھی اس بارہ میں نہیں لکھی حالانکہ ان کا فرض تھا کہ وہ پہلے یہ بتاتے کہ انجیل میں مسیح نے یہ دعوی کیا ہے اور انہیں معنوں میں کیا ہے کہ جن میں مسیحی صاحبان کرتے ہیں۔ ہم تو انجیل میں کہیں یہ دعوے نہیں پاتے یسوع بیچارہ تو آپ لوگوں سے ڈرتا ہؤا ہمیشہ اپنے آپ کو ابن آدم کے لفظ سے پکارتا ہے۔ تا کہ احمق میری پیدائش کو عجیب خیال کر کے کہیں مجھ کو کچھ اور ہی نہ سمجھ لیں مگر مسیحی صاحبان پھر بھی باز نہ آئے پس جب تک ابنیت کا دعویٰ اور دلائل انجیل سے ہی نہ بتائے جائیں تب تک تو مدعی سست اور گواہ چست والا معاملہ ہے یسوع تو اپنے آپ کو ابن آدم قرار دیتا ہے اور مسیحی صاحبان زبردستی اسے خدا کی ولایت کا خلعت عطا فرماتے ہیں گویا کہ خدا کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک متبنّیٰ بنائے۔

مصلوب ہونے سے پہلی رات

اسی طرح کفارہ کا حال ہے کہ اس کا بھی کوئی ذکر انجیل میں نہیں مگر مسیحیوں نے من مانے عیش اڑانے کے لئے اس مسئلہ کو گھڑ لیا ہے۔ کیونکہ جب خدا ہی کسی کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لے تو پھر اسے کیا پرواہ۔ ادھر مسیحی اس زور سے کفارہ کا اعلان کرتے ہیں اور مسیح کو اپنی خوشی سے بنی نوع انسان پر قربان ہونے والا خیال کرتے ہیں ادھر یسوع کو دیکھیں تو وہ صلیب پر چڑھنے سے پہلے دردناک الفاظ میں خدا تعالیٰ سے اپیل کرتا ہے کہ للہ اگر کوئی صورت بچانے کی ہو تو اس پر عمل کیجئے کیونکہ یہ گھڑی مجھ پر بہت سخت ہے۔ حالانکہ اگر کفارہ کا مسئلہ ہوتا تو یسوع کو چاہیئے تھا کہ اس دن عید مناتا اور ساری رات خوشی اور خرمی میں گزارتا کہ آج وہ مبارک دن آیا ہے کہ جس کے فراق میں گھڑیاں گننی مشکل ہو گئیں تھیں مگر اس کے برخلاف وہ روتا ہے وہ چلاتا ہے۔ وہ آنے والی مصیبت کے خوف میں کبھی بیٹھتا ہے کبھی کھڑا ہوتا ہے کبھی زمین پر گر کر ذلیل حالت بنا کر خدا کے حضور میں گڑگڑاتا ہے کہ اے باپ جس کے لئے میں نے بہت دکھ اٹھائے یہاں تک کہ مجھے کسی جگہ پر ٹھہرنا تک مشکل ہو گیا یہ مصیبت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی اگر ہو سکے تو اس کو ٹال دے۔ تو پھر گھبراہٹ میں اپنے حواریوں میں آتا ہے کہ اٹھو اور تم بھی دعاؤں میں مشغول ہو جاؤ کہ نا معلوم خدا کس کی سنے اور میں مصیبت سے بچ جاؤں۔ چنانچہ اسی لئے وہ شہر سے باہر ایک خفیہ جگہ میں جا کر بیٹھا رہا کہ کسی طرح

یہ وقت گزر جائے پس کیا اس کرب و اندوہ ظاہر کرنے والے کو کہا جا سکتا ہے کہ وہ خوشی سے تمام دنیا کے گناہ اپنے کندھے پر اٹھا کر پھانسی پر لٹک گیا؟ پھر یہ نہ بھی ہو تو کیا کبھی ہو سکتا ہے کہ ایک کے سر میں درد ہو تو دوسرا اپنے سر پر پتھر مارے یہ کبھی نہیں ہوتا جو گناہ کرتا ہے وہی پکڑا جاتا ہے ورنہ کفارہ سے تو معلوم ہؤا کہ خدا کو سزا دیتے ہوئے مزہ آتا ہے یہ نہ سہی وہ سہی مگر کوئی نہ کوئی ہونا چاہیئے کہ جس کو وہ سزا دے۔ ہاں ایک بات اور بھی ہے کہ اگر شیطان کا سر کچلا گیا اور مسیح کفارہ ہوئے تو خود شیطان اور قاتل یہود کیوں نہ کفارہ سے مستفید ہوں۔

انبیاءؑ بائبل کفارہ سے ناواقف تھے

علاوہ اس کے یسوع کے نزول سے پہلے لوگوں کا کیا حال ہوگا وہ بیچارے تو سب جہنمی ہوئے جن میں کہ موسیٰؑ اور داؤدؑ بھی شامل ہیں۔ پھر کیا خدا پر الزام نہ آیا کہ اگر بیٹے کو پھانسی دینی ہی تھی تو شروع میں دیتا اور نہ کہ دنیا کے خاتمہ پر اور یہ بھی غلط ہے کہ وہ کفارہ پر ایمان لائے تھے کیونکہ اول تو توریت میں اس کا کوئی ذکر نہیں دوسرے حضرت یوسفؑ کے ایک قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کفارہ پر نہ صرف ایمان ہی نہ تھا بلکہ اس کو ظلم قرار دیتے تھے چنانچہ جب بنیامین کے بورے میں پیالہ نکلا تو یہودا نے کہا کہ ہم بھی اپنے آپ کو گناہ میں غلام بناتے ہیں مگر یوسفؑ نے کہا کہ خدا نہ کرے کہ میں ایسا کروں اور جب وہ اس قدر زاری کر رہے تھے تو وہ یوسفؑ کو یسوع کے کفارہ کی یاد دلا کر ایسا کر سکتے تھے کہ اپنے میں سے ایک کو اسکے بدلے میں چھوڑ جائیں اور بنیامین کو لے جائیں۔

یسوع جہنم میں تین دن کیوں رہا

علاوہ اس کے کفارہ پر ایک یہ اعتراض بھی پڑتا ہے کہ خدا نے لوگوں کو تو گناہوں کے بدلہ میں ابدالآباد کی سزا دی اور اپنے بیٹے کو صرف تین دن سزا دے کر چھوڑ دیا حالانکہ اسکے سر پر سب دنیا کے گناہ تھے اسکے لئے تو کوئی اور بھی سخت دوزخ بنانی چاہیئے تھی اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں چونکہ وہ خدا تھا اور غیر محدود تھا اس لئے تین دن کی سزا کافی تھی تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ غیر محدود کی نسبت محدود سے ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ چونکہ وہ غیر محدود تھا تو سزا تو ایک منٹ کیا بلکہ ایک ایسے چھوٹے وقت میں ہونی چاہیئے تھی کہ وہ گنا بھی نہ جاتا ورنہ اگر تین دن کی سزا مقرر ہوگی تو بندوں میں اور خدا میں ایک نسبت ہو جائے گی اور اس طرح غیر محدود نہ رہے گا بلکہ محدود ہو جائے گا اور اگر کہا جائے کہ تین دن کی سزا علی الحساب دے دی گئی ہے تو خدا اس طرح ظالم بن جاتا ہے۔ کفارہ پر ایک اور بھی اعتراض ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب ایک تین اور تین ایک ہیں تو جب یسوع تین دن مرا رہا تو

ضرور ہے کہ باقی دونوں خدا بھی مرے رہے ہوں کیونکہ ایک تین ہے اور اگر وہ نہ مرے ہوں تو دو خدا باقی رہ گئے ہوں گے اور اس طرح خداؤں میں جدائی لازم آئے گی جو کہ تین ایک اور ایک تین کے مسئلہ کے برخلاف ہو گا اور اگر کہا جائے کہ نہیں اصل میں خدا تینوں ہی زندہ رہے تھے وہ ایک اور ہی کارروائی تھی تو پھر بھی کفارہ باطل ہو جاتا ہے اور خدا نعوذ باللہ بہانے باز ٹھہرتا ہے۔

کیا یسوع عادل ہے؟

علاوہ ازیں کفارہ کے مسئلہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تو عادل ہے اور یسوع عادل نہیں پس یا خدا ناقص ہؤا یا یسوع۔ علاوہ ازیں دونوں کی مختلف صفات مان کر دو وجود الگ الگ ماننے پڑتے ہیں کہ یہ خدا ہے جو عادل ہے اور یہ یسوع ہے جو محبت ہے سو اس طرح ایک تین اور تین ایک نہیں رہتا اور خداؤں میں فرق لازم آتا ہے۔ علاوہ ازیں کفارہ پر یہ بھی ایک اعتراض ہے کہ اگر کفارہ پر ایمان لانے کے باوجود بھی عمل کی ضرورت ہے تو وہ کفارہ کفارہ ہی نہ رہا کیونکہ اس صورت میں مسیح کی موت سے ہم کو کچھ فائدہ نہ ہؤا۔ اور اگر عمل کرنے کی ضرورت نہیں تو کفارہ سے گناہ پھیلیں گے نہ کہ رکیں گے اور اس طرح کفارہ گناہ پھیلانے والا ثابت ہو گا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کفارہ پر ایمان لانے سے گناہ ہوتے ہی نہیں تو یہ بھی غلط کیونکہ جس قدر گناہ یورپ میں ہو رہا ہے اس قدر نہ پہلے ہؤا نہ اب غیر قوموں میں ہے کہا جاتا ہے کہ ساٹھ فیصدی حرامی بچے پیدا ہوتے ہیں پھر کفارہ کا کیا اثر؟

کیا یسوع کامل نمونہ تھا

یسوع کے کفارہ پر ایمان لا کر دنیا نے گناہوں سے کیا بچنا ہے جو کچھ انجیل پیش کرتی ہے اس سے تو خود یسوع پر بھی سو سو اعتراض وارد ہوتے ہیں اور وہ قابل تقلید کیا قابل نفرت ٹھہرتا ہے۔ اور اس طرح مسیحیوں کا یہ کہنا بھی کہ دنیا کو نمونہ کی ضرورت ہے اور یسوع نمونہ بن کر آیا غلط ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے نمونہ کو دیکھ کر تو اور بھی شکوک شروع ہو جاتے ہیں کہ جب خدا خود گناہوں سے نہیں بچ سکتا تو بندے بیچارے کس حساب میں۔ وہ خود بھی بیچارہ کہتا ہے کہ مجھے نیک مت کہو۔ پس یا تو اسکو جھوٹا قرار دو یا گناہ گار دونوں صورتوں میں قابل تقلید نہیں۔ مسیحی صاحبان یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ گناہ آدم کے ورثہ میں آیا ہے اور یسوع کا باپ نہ تھا اس لئے معلوم ہؤا کہ وہ گناہ گار نہیں ہو سکتا تھا تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ یسوع کی لائف اس پر خوب روشنی ڈالتی ہے دوسرے سوال یہ ہے کہ آدمؑ میں گناہ کہاں سے آگیا اگر آدمؑ میں پیدا ہو سکتا تھا تو دوسرے آدمیوں میں اسے پیدا ہوتے کیا حرج ہے چوتھے یہ کہ اس سے مسیح کی فضیلت نہیں نکلتی بلکہ الٹا نقص نکلتا ہے کیونکہ توریت ہم کو بتاتی ہے کہ اصل گناہ

عورت کی طرف سے تھا چنانچہ پیدائش باب ۳ آیت ۱۲ میں ہے کہ آدم نے کہا کہ اس عورت نے جسے تو نے میرے ساتھ کر دیا تھا مجھے اس درخت سے دیا اور میں نے کھایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل گناہ کا منبع عورت تھی۔ تو اس صورت میں مسیح کے بن باپ پیدائش سے تو اور بھی نقص لازم آتا ہے اور وہ بجائے اس کے کہ گناہ سے پاک ٹھہرے اور بھی گناہ میں ملوث ثابت ہوتا ہے کیونکہ آدم کا پاک حصہ اس نے نہ لیا اور حوا کا وارث بنا۔

کفارہ بے فائدہ نکلا

اب آخر میں دو قطعی ثبوت پیش کرتا ہوں کہ کفارہ پر ایمان لانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اول تو یہ کہ مسیح نے کہا ہے کہ "میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں اگر یقین کرو اور شک نہ لاؤ تو نہ صرف یہی کر سکو گے جو انجیر کے درخت پر ہؤا۔ بلکہ اگر اس پہاڑ سے کہو گے کہ تو اکھڑ جا اور سمندر میں جا گر تو ویسا ہی ہو گا" (متی ۲۱:۲۱) اب پادری صاحبان کل مسیحی ممالک سے زیادہ نہیں تو ایک آدمی ہی اس قسم کا پیش کر دیں جو اس قسم کا معجزہ دکھائے ورنہ یا تو کفارہ ہی غلط ثابت ہؤا نہیں تو سب کے سب مسیحی صاحبان بے ایمان ثابت ہوئے۔ دوسرا یہ کہ توریت میں ہے کہ آدم کو گناہ کے بدلہ میں خدا نے کہا کہ تو اپنے منہ کے پسینہ سے روٹی کھائے گا اور عورت دردزہ سے بچہ جنے گی پس اس کفارہ پر ایمان لانے کے بعد تو چاہیئے تھا کہ مسیحی صاحبان ان دونوں عذابوں سے بچ جاتے لیکن مشاہدہ تو یہ ثابت نہیں کرتا پس جب کفارہ کا کچھ بھی فائدہ نہیں تو اس کے پیش کرنے سے کیا فائدہ؟ ہم تمام مسیحی دنیا سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ لوگ بے محنت روٹی کھاتے ہیں یا آپ کی عورتیں بغیر درد کے بچہ جنتی ہیں اگر ایسا نہیں تو پھر کفارہ نجات کا باعث ہرگز نہیں اور ہرگز نہیں۔ پس اب میں ثابت کر چکا ہوں کہ نجات اعمال سے ہی ہوتی ہے اور اعمال فضل کو حاصل کرتے ہیں اور اعمال کیلئے کامل شریعت کی ضرورت ہے اور جو شریعت اپنے آپکو اعمال کا سدھارنے والا نہیں مانتی وہ ناقص ہے اور یہ کہ کفارہ کا نجات سے کچھ تعلق نہیں کیونکہ نہ مسیح خوشی سے صلیب پر چڑھا اور نہ وہ صلیب پر مرا جیسے کہ میں متی کے حوالہ سے بتا آیا ہوں کہ اس کا زندہ رہنا زیادہ یقینی ہے اور یہ کہ نہ صرف کفارہ ایک لغو مسئلہ ہے بلکہ اس کا نتیجہ اب تک عیسائیوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ ہم رحم کر کے اپنے سے کمزوروں کے گناہ بخشتے ہیں پس خدا بدرجہ اولیٰ بخشتا ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

میرزا محمود احمد

(تشحیذ الاذہان دسمبر ۱۹۰۹ء)